مولانا ڈاکٹر غلام محمد

اسلام کا نظامِ روحانی

—— یہ مقالہ مارچ ۸۸ء میں منعقدہ سالانہ محاضراتِ قرآنی میں پڑھا گیا ——

الحمد للہ الاحد الواحد القدیم والصلوٰۃ والسلام علیٰ حبیبہ الافخم سیدنا ومولانا محمد النبی الامی وعلیٰ آلہ و صحبہ اجمعین — امابعد

سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ میں ایک حقیقتِ امری کی نشاندہی یوں فرمائی گئی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ	جب کہ (اے محمدؐ) آپ کے رب نے
مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ	اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا
اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ج	اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کیا
اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ط قَالُوْا بَلٰی ج	میں تمہارا رب نہیں ہوں! سب نے
شَهِدْنَا ج اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ	جواب دیا کیوں نہیں، ہم سب گواہ ہیں
الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا	کبھی کہنے لگو قیامت کے دن کہ ہم تو اس
غٰفِلِیْنَ o	سے محض بے خبر تھے!

بقول حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ "یہ تخمِ ہدایت کی وہ کاشت تھی جسے کل آسمانی تعلیمات کے مبداء و منتہا کا وجودِ مجمل کہنا چاہیئے، اس کو عام فیاضی کے ساتھ نوعِ انسانی کے عام افراد میں بکھیر دیا گیا تاکہ آئندہ ہر آدمی وحی الٰہی و الہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجرِ ایمان و توحید کے درجہ تک پہنچا سکے"[۱]

قرآن نے عہد الست کا ذکر کیا ہی اس لئے تاکہ انسان اس کو خوب یاد رکھے، اس کو

---

[۱] تفسیری حواشی بر ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

اپنے راہِ حیات کا چراغ اپنی منزل کا نشان اور اپنے پرکارِ عمل کا مرکز و محور بنائیے ۔ اس کی یاد تازہ ہے تو عرفانِ نفس بھی حاصل ہے اور عرفانِ رب بھی ، اس کی یاد ہمارا ہوش اور اس کی فراموشی ہماری بیہوشی ہے ۔ غور کیجیے کہ اسی عہد سے ہمیں پتہ چلا کہ :

۱۔ ہماری اصل یا ہمارا وجود عبارت ہے روح سے ۔

۲۔ ہمارا وطن عالمِ ارواح ہے جو ہماری ناسوتی حیات کی نسبت سے آخرت ہے ۔

۳۔ ہماری منزل قربِ الٰہی اور ہمارا آبِ حیات مشاہدۂ ربانی ہے ۔

۴۔ ہمارا خمیر عشقِ الٰہی سے اٹھایا گیا ہے (یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ) محبتِ الٰہی کے بغیر ہماری زندگی لفظِ بے معنی اور ذکرِ الٰہی کے بغیر ہمیں چین میسر نہیں آسکتا (اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ)

۵۔ ہمارے سفر کا مبداء و معاد یا مصدر و مرجع اَلَسْتُ و بَلٰی والا نقطہ ہے ، یہی اَنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُونَ کا حاصل بھی ہے اور عارفِ رومی نے اسی کی ترجمانی کی ہے ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

۶۔ عہدِ الست ہی کے ذریعہ انسان توحید کا دائماً مکلف بنا ، اگر یوم الست مکلف نہ بنتا تو اس دنیا میں آکر اس کا مامور بہ توحید رہنا ناممکن ہو جاتا اور ربِ الوہیت کا اقرار نہ ہو سکتا تو دنیوی اعمال پر جزا و سزا بلکہ فی نفسہٖ خیر و شر کی واقعی تمیز تصور سے باہر رہتی ۔

مذکورۂ بالا حقائق سے معلوم ہوا کہ جب تک عہدِ الست ہمارے انفرادی و اجتماعی ، دنیوی و اخروی اعمال کا مرکز و محور ہے ۔ اس وقت تک ہم عبداللہ ، خلیفۃ اللہ اور ولی اللہ ہیں اور جہاں اس محور سے ہٹے اور جب تک ہٹے رہے ہم شرفِ انسانی سے گر کر کہیں کے نہ رہے ، کالانعام بل ھم اضل کا مصداق بن گئے ۔ !

؎ ہش دار کہ راہ خود گم نہ کنی

ان حقائق کو سمجھ کر اب آئیے روح کے سفرِ ناسوتی کا جائزہ لیں ۔ انسانِ اوّل یعنی حضرت

© rasailojaraid.com

آدم علیہ السلام جب وطن اصلی سے نکل کر اس زمین پر اتر آئے چونکہ وہ انسان اول کے ساتھ ساتھ نبیٔ اول بھی تھے، ان کی روح مزکی اور ان کا قلب مصفا تھا اس لیئے مادی حجابات ان کے لیئے شفاف شیشے تھے، وہ مہجور وطن ہو کر بھی وطنی لذتوں سے سرشار تھے۔ قرب الٰہی بھی حاصل تھا اور مکالمۂ ربانی سے بھی مشرف تھے، مگر ان کی ذریت جو پھیلی اور پھیلتی چلی گئی وہ ناسوتی حجابات میں آکر اپنے وطن، وطن کی بہار، اپنی تخلیقی غایت، اپنے سفر حیات کے آغاز و انجام کو یکسر بھلا بیٹھی، علم سے عاری ہو کر جہل میں اور عرفان سے محروم ہو کر فریب نظری میں مبتلا ہو گئی۔ آدم زادوں کو ان ظلمات عارض سے نکال کر الست کا سبق یاد دلانے اور حقائق الست کو ان پر بے نقاب کرنے کے لیئے اللہ تعالیٰ نے ہادیان برحق بھیجے اور بالآخر خاتم النبیین، سردار رسل محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت الٰہی کے اکمال و اتمام کے لئے مبعوث فرمایا۔ وہ تشریف لائے اور حیات کے دھارے پر آنکھیں بند کئے بہی جانے والی انسانیت کو چونکا دیا، حیات کی اس عارضی موڑ پر جس کا نام دنیا ہے رہنے اور گذر جانے کا ڈھنگ سکھایا، اپنی ذات اور اپنے طرز حیات کو گواہ ٹھہرا کر انہیں سفر آخرت کا شعور بخشا، فرمایا:

مالی و للدنیا ما انا فی الدنیا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح و ترکھا

مجھے دنیا (کی لذتوں راحتوں) سے کیا سروکار، دنیا میں میری مثال اس سوار مسافر کی سی ہے جو سایۂ شجر میں سستائے اور چلتا بنے۔

اور حکماً فرمایا:

کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔

دنیوی زندگی تو بس اجنبیانہ اور مسافرانہ طور پر بسر کر دو!

یہ اپنی طرف سے فرمایا اور اس کے ساتھ الٰہی تنبیہات بھی سنائیں مثلاً فرمایا کہ دیکھو اللہ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ

جس نے ہر اقدام میں، آخرت کی نیت رکھی اور اس کے لئے کوشش کی جیسا

© rasailojaraid.co

سَعْیُهُمْ مَشْكُوْرًا۔ کوشش کا حق ہے اور وہ مومن ہو تو ایسے ہی لوگوں
(الاسراء - ۱۹) کی مساعی نگاہِ حق میں قابلِ قدر ٹھہریں گی

غور کیجئے کہ یہی سفرِ آخرت کا ہمہ وقتی شعور ہے جو مسلمان کے زہد، ورع، تقویٰ، مصیبت میں صبر، راحت میں شکر، فقر میں شاہی اور شاہی میں فقر و بے نیازی کا ضامن ہے، کیونکہ منزل دوست مسافر کی نظر راستہ کی تکلیف یا راحت پر کب ہوتی ہے، بقول ہمارے شیخ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ:

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے — وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
حیاتِ دو روزہ کا کیا عیش و غم — سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

اس مرحلہ پر اس فرقِ منازل کو بھی ذہن میں لائیے کہ انسان یا تو اپنے وطن میں صرف مشاہدۂ ربانی میں مگن تھا یا تاریک دنیا میں آکر "مجاهده" کا پابند کر دیا گیا، امتحان میں ڈالا گیا۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ — اسی نے موت و حیات پیدا کی تاکہ تم کو
لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ — آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا
(الملک - ۲) ہے۔

جہاں روشنی تھی مطالبۂ عمل نہ تھا، جب تاریکی میں گھر گئے تو مجاہدہ واجب ٹھہرا، اب بے بصر و بے خبر انسان منزل کی طرف چلے تو کیوں کر چلے، اس کی اسی ہدایت کے لئے قرآن پاک اتارا گیا جو فرقان ہے کہ حق کو حق باطل کو باطل دکھلا دیتا ہے، جو نور ہے کہ راہِ آخرت کو روشن کرتا ہے، جو شفا ہے کہ نفس کے روگ کو دور کر کے اس کے ذائقہ کو درست کرتا اور قلب کے زنگ کو چھڑا کر معرفتِ حق کے قابل بناتا ہے۔ جو رحمت ہے کہ دنیا کی ہر زحمت کو راحت سے بدل دیتا ہے۔ جو ھُدٰی ہے کہ بچھڑے ہوئے انسان کو پھر اپنے مولیٰ سے ملا دیتا ہے۔ مگر غور کی بات یہ ہے کہ یہ ربانی نظامِ حیات اور یہ کلام اللہ اترا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر ہی پر تھا، اور وہیں جمع ہو کر جب نطقِ نبویؐ سے اس کا اظہار انسانیت پر ہوا تو بظاہر انسان کا کان اس کو سن رہا تھا مگر اس کا اثر صرف وہیں ہو رہا تھا

© rasailojaraid.com

جہاں اثر پذیر دل موجود تھا، خود قرآن کہہ رہا ہے :

لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ	ہر اس شخص کے لئے جو دل رکھتا ہو

(ق ۔ ۳۷)

یہ کیوں؟ اس کا جواب عالمِ ربانی علامہ ابنِ قیم یہ دیتے ہیں کہ:

فصاحب القلب الحی بین	اس لئے کہ زندہ قلب والے کے
قلبه وبین معانی القرآن	قلب اور قرآنی معانی میں اتصالِ اتم
اتم الاتصال	پایا جاتا ہے۔

اور فرماتے ہیں کہ یہاں آیتِ پاک میں قلب سے مراد "قلبِ بیدار" ہی ہے نہ کہ دلِ مردہ۔

والمراد به القلب الحی الذی	اور یہاں قلب سے مراد زندہ قلب
یعقل عن اللہ، کما قال اللہ	ہے جو اللہ کی معرفت رکھتا ہو جیسا
إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ	کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، یہ تو
مُبِينٌ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا	خالص نصیحت اور صاف پڑھی جانے
ــــ ای حی القلب[۹]	والی کتاب ہے تاکہ ہر اس شخص کو ڈرائے

جو زندہ ہو ــــ یعنی زندہ دل رکھنے والا ہو۔

معلوم ہوا کہ اصلاً اور آخرکار ہدایت پذیری کا تعلق قلب انسانی سے ہے جو اس دنیا میں روح کی آنکھ اور اس کا حاسۂ ادراک ہے۔ ثانی طور پر البتہ اسی آیت میں اثر پذیری کی ایک صورت یہ تبلائی گئی ہے:-

أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ	یا جو کان دھر کر توجہ سے سنے

(ق ۔ ۳۷)

یہاں کان اور دھیان کو قلب تک ہدایت رسائی کے وسائل قرار دیے گئے ہیں، باقی حیات اور ہدایت پذیری تمام تر قلب ہی سے متعلق ہے۔ اسی لئے ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

---

۹ التفسیر القیم مرتبہ مولانا محمد ادریس نگرامی ندویؒ

© rasailojarai

نے فرمایا :-

الا ان فی الجسد لمضغۃ اذا	سن رکھو کہ انسانی جسم میں ایک لوتھڑا ہے
صلحت صلح الجسد کلہ و	جب وہ سدھر جاتا ہے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے
اذا فسدت فسد الجسد کلہ	اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا
الا و ھی القلب	ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ قلب ہے !

اسی قلب کو تقوے کا مرکز بھی بتلایا، اس طرح کہ اپنے دست مبارک سے اپنے قلبِ اطہر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

و التقوٰی ھٰھنا	تقویٰ کی جگہ یہ ہے ۔

بہتر سے بہتر ضابطۂ حیات انسان کو انسانِ کامل نہیں بنا سکتا جب تک کہ اس کی تنفیذ میں اندر سے باہر، قلب سے جوارح، نیت سے عمل، شعور داخلی سے ثبوت خارجی اور فرد سے اجتماع کی طرف کا اصول نہ برتا جائے۔ یہی تمام ہادیانِ برحق اور خود ہادیٔ اعظم و خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کا اصول رہا اور اسی کی پیروی ہم پر لازم قرار دی گئی ۔

اب آئیے ایک اور حقیقت پر غور کریں، عالمِ ارواح میں گو ہم قیدِ زمان و مکان سے باہر نہیں تھے مگر وہ زمانِ الٰہی سے الگ ایک زمانِ غیر زمانی اور مکان نا متناہی تھا، نہ وہاں ' ماضی ' حال مستقبل تھا، نہ یہ تشکیلیں تھیں نہ صورتیں۔ عمل مشاہدہ تھا مگر بلا صورت عمل کے، مکالمہ تھا مگر بلا لسان و صوت کے، مگر سفرِ حیات کی ناسوتی منزل میں پہنچ کر روح پابند جسم ہو کر اعمال کی صورتوں کے تعین پر مجبور ہو گئی۔ جس کو اسلام اعمالِ صالحہ قرار دیتا ہے۔ وہ بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہ سکے گو مقصود اصلی ان کی حقیقت یا روح ہی رہی مگر چونکہ اس عالم میں کوئی روح بلا قالب پائی نہیں جا سکتی اس لئے وہ قالب بھی مطلوب رہے۔ استاذ فلسفہ صوفیٔ صافی بزرگ حضرت مولانا عبد الباری ندویؒ فرماتے ہیں:

" بات یہ ہے کہ کسی شے کے کمال کا تعلق ہمیشہ اس کے ظاہر سے زیادہ باطن، کم سے زیادہ کیف، قشر سے زیادہ مغز یا جسم سے زیادہ جان اور صورت سے زیادہ معنی سے ہوتا ہے .... جس طرح " انسانِ کامل " کے دو رخ ہیں، ظاہر و باطن یا قلب و قالب، اسی طرح " دینِ کامل " کے بھی دو رُخ ہیں، شریعت و طریقت

© rasailojaraid.com

اور جس طرح شریعت نام ہے ظاہر یا قالب کے اعمال و احکام کا، اسی طرح طریقت یا تصوّف نام ہے باطن یا قلب کے اعمال و احکام کا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ تصوّف نام ہے باطن کی فقہ کا، جس طرح نماز روزہ وغیرہ ارکان کی ایک ظاہری صورت ہے جس کے احکام فقہ میں بیان ہوئے ہیں، اسی طرح خشوع و خضوع، حضورِ قلب یا دل سے حق تعالیٰ کی یاد و ذکر (اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ) قلب و باطن کے اعمال ہیں۔ جس طرح اکل و شرب، روزہ کا ظاہر ہے اسی طرح اس کا باطن (لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ) ہے، پھر جس طرح مختلف اعمالِ شرعیہ اپنی اپنی قالبی صورت رکھتے ہیں، اسی طرح ان سب کی صحت و سقم، قبول و عدم قبول کا مدار قلبی نیتوں (انما الاعمال بالنیات) اور درجاتِ اخلاص پر ہے، سب سے بڑھ کر ایمان اور عقائد جن پر نجات اور ظاہری جوارح کے سارے اعمال کی صحت و قبولیت کا مدار ہے اور جن کے بغیر نہ نماز نماز ہے نہ روزہ روزہ، وہ بالکلیہ یقین و اذعان کے قلبی و باطنی فعل ہی کا نام ہیں[1]

غرض عالمِ ناسوت میں ہمارا وجود جس طرح روح مع الجسد کا نام ہے اسی طرح یہاں ہمارے اعمال کا اعتبار بھی مخصوص معنویتوں کے ان کے مخصوص اشکال کے ساتھ جمع ہونے ہی میں متصور ہو سکتا ہے۔ اسی نکتہ کو نہ سمجھنے سے مسلمانوں میں اہلِ ظواہر اور اہلِ باطن کے دو گروہ پیدا ہوئے اور دونوں حقیقت سے بیگانہ رہے۔ شیخ الشیوخ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

"عبادت کی روح محبت و عشق ــــــ یہ سب جب پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ساتھ پایا جائے گا کیونکہ مطلق من حیث ہو مطلق نہیں پایا جا سکتا، کلّی مرتبۂ کلی میں کبھی نہیں پائی جا سکتی، جس طرح کہ انسان جب پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ضمن میں پایا جائے گا۔ اب ہم دیکھتے ہیں روحِ عمل، یعنی توجہ الی اللہ کے جو افراد مطلوب ہیں وہ اس شخص کے ساتھ تو مطلوب نہیں جو بلا واسطہ کسی عملِ ظاہری کے ہو۔ کیونکہ اس میں کوئی مشقّت و کلفت و مجاہدہ ہی نہیں، بلکہ مطلوب خاص وہ افراد ہیں جو ضمن میں کسی عملِ ظاہری کے ہوں، پس اگر کوئی عمل ظاہری نہیں تو وہ شخص نہیں اور کلّی من

---

[1] تجدیدِ تصوف (مطبوعہ لکھنؤ) صفحات ۴ تا ۶۔

© rasailojaraid
© rasailojaraid

حیث ہو کلی کا وجود ہوتا نہیں، پس وہ توجہ الی اللہ ہی نہ پائی گئی ...... اور اگر کوئی عمل ظاہری کیا ہے تو صورت کی حاجت ہوئی تو اسے مدعی وہی صورت کیوں قبول نہیں کرتا جو محبوب نے تجویز کی ہے، جب صورت سے چارہ نہیں تو صورت مجوزۂ محبوب سے اچھی کونسی صورت ہوگی؟" [1]

ایک اور موقع پر فرمایا:

"اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمالِ ظاہرہ حکمِ خداوندی ہیں، اسی طرح اعمالِ باطنہ بھی حکمِ الٰہی ہیں۔ کیا اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ امر کا صیغہ ہے اور اصبروا، واشکروا، امر کا صیغہ نہیں؟ کیا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ سے روزے کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہے اور والذین اٰمنوا اشد حبا للہ سے محبتِ الٰہی کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال سب ہی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں اور باطن کی صفائی مقصود و موجبِ نجات اور اس کی کدورت موجبِ ہلاکت ہے۔"

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس ۹)

بے شک جس نے نفس کو صاف کیا وہ کامیاب رہا اور جس نے اس کو میلا کیا، ناکام رہا۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (الشعراء - ۸۸)

جس دن مال اور اولاد کام نہ آئیں گے بجز اس کے کہ جو شخص اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے۔

دیکھو پہلی آیت میں تزکیۂ باطن کو موجبِ فلاح اور دوسری میں سلامتیِ قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع بتلایا ہے۔" [2]

غرض اس جمع اضداد دنیا میں اگر حیاتِ انسانی کو عام حیاتی سطح سے جو دراصل سطحِ حیوانی ہے ایمانی سطح پر لانے کے لئے جو دراصل سطحِ روحانی ہے یا یوں کہئے آلودہ زندگی کو "حیاتِ

---

۱ وعظ مسمّٰی بہ "روح الارواح"
۲ رسالہ "حقیقتِ تصوف" از حضرت تھانوی

© rasailojaraid.c

طیّبہ" والی منزل میں پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بیک وقت صورتِ اعمال بھی حاصل کی جائے اور روحِ اعمال بھی جذب کی جائے۔ صورتِ اعمال تو قرآنی و حدیثی صراحتوں اور حضور انورؐ کے نمونۂ اعمال سے ملیں گی، جس کا درس ہر عالمِ دین سے مل سکتا ہے۔ البتہ روحِ اعمال جو بذریعہ صحبت منجذب ہو کر منتقل ہوتی آ رہی ہے، کسی مستند صحبت یافتہ اور مجاز صحبت بزرگ ہی سے بطریق انجذاب حاصل کی جاسکتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک لاکھ سے زائد دورِ نبویؐ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا شرف "صحابیت" ہی ہے اور اس شرف میں اس طبقۂ مقدس کے عالم و عامی، شمشیر زن اور شاعر، صفہ نشین اور صاحبِ خلافت سب برابر ہیں، اسی فیضانِ صحبتِ نبوّی نے انہیں 'احسان' کے مرتبہ اعلیٰ تک پہنچایا تھا، ذاتِ حق، اور جنت و دوزخ گویا ان کی کھلی آنکھوں کے سامنے آگئے تھے اور ان کی وطنِ اصلی سے مہجوری صرف ضابطہ کی ہوگئی تھی۔ ظاہر و باطن کی یہ جامعیّت خلفائے راشدین کے زمانہ تک برقرار رہی۔ پھر اموی خلفاء نے شریعت کے صرف ظاہری قوانین کی تنفیذ کو اپنی ذمہ داری قرار دے کر تزکیۂ نفس اور صحبت کے ذریعے روحِ اعمالی کی منتقلی کے فریضہ سے دست بردار ہوگئے، اس دور کے آغاز سے ظاہر و باطن میں تفرقہ پڑگیا۔ ظاہر شریعت کا نام فقہ اور باطن شریعت کا نام بعد کو تصوّف پڑگیا۔ اموی خلفاء کے اس حال کو دیکھ کر جن حضرات نے باطنی تربیت اور فیضانِ صحبّت کا کام سنبھالا وہ پہلے زہاد پھر عباد پھر صوفی کہلائے، اور حقیقت یہ ہے کہ پھر انہی کے ذریعہ اتّباعِ محمّدی کو دنیائے دار الامتحان میں عملی کامیابی حاصل ہوتی رہی۔ انہی نے فقیری میں شاہی کی۔ اور بادشاہتیں پاکر فقیرانہ طرزِ حیات کے نمونے پیش کئے، کامیاب زندگی جو عبارت ہے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جامع ظاہر و باطن اسوۂ حسنہ کی پیروی سے، اس کی تحصیل کا طرز قطبِ ربّانی محبوبِ صمدانی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرّہٗ یہ بتلاتے ہیں کہ:۔

کُن مع اللہ عزّ وجلّ کَاَنْ لَّا	اللہ کے ساتھ اس طرح رہ گویا مخلوق
خلق و مع الخلق کَاَنْ لَّا نفس،	موجود ہی نہیں اور مخلوق کے ساتھ
فاذا کنت مع اللہ عزّوجلّ	اس طرح رہ گویا نفس موجود ہی نہیں
بلا خلق وجدتّ ہٗ عَنـ	پس جب تو مخلوق کے بغیر اللہ کے ساتھ

© rasailojaraid.com

الکل فنیت واذا کنت مع الخلق بلا نفس عدلت و اتقیت وعن التبعات سلمت (فتوح الغیب - مقالہ ۷۷)	ہوگا تو تو اللہ کو پائے گا اور سب سے فنا ہو جائے گا اور جب تو بلا نفس کے مخلوق کے ساتھ ہوگا تو تو عدل کرے گا اور حق پر قائم رہے گا اور برے انجام سے محفوظ رہے گا۔

اسم بامسمّی حضرت محی الدین الجیلی قدس سرہٗ نے جو بات ارشاد فرمائی میں نے نقل کر دی اور آپ نے سن لی مگر فرق یہ ہے کہ یہ عاجز یہ اطلاع پہنچا کر آپ کو اس حال کا صاحب حال نہیں بنا سکا جبکہ حضرت شیخ نے اپنی صحبت اور فیضانِ نظر سے اپنے مخاطبین کو اس مقام تک پہنچا کر "انسانِ کامل" بنادیا تھا۔ آج بھی یہ درس حاصل کرنا ہو تو وہ کسی قائد سے نہیں، معقولی سے نہیں اور نرے مولوی سے بھی نہیں بلکہ کسی کامل المعرفت قوی نسبت صوفیٔ صافی کی صحبت بابرکت سے حاصل کرنا ہوگا، اس کی صحبت سے قلب کو جلاء ملے گی، اس میں نور آئے گا اور پابند جسد روح پھر اس نورانی حاسہ سے آلستی حقائق کو "کانک تراہ" پانے لگے گی، پھر یہی شخص ہوا وہوس سے نکل کر صاحب عدل ہوگا۔ اور کوئی دنیوی تحریص اس کو "حق" سے ہٹا نہ سکے گی یہی باکمال انسان ارضی خلافت کا فریضہ انجام دے سکے گا، دنیوی اقتدار اس کو منجانب اللہ ملے گا کیونکہ اللہ پاک سے زیادہ وعدہ کا سچا کوئی نہیں، اور اس کا وعدہ ہے:

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُہَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء : ۱۰۵)	اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔

اور جب اقتدارِ خلافت کی باگ ایسے "کامل انسان" کے ہاتھ میں آئے گی تو دنیا اس خلیفہ کے اندر پیمبرانہ تجلیات کا پرتو کھلی آنکھوں سے دیکھے گی، جیسا کہ رازدانِ حقیقت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

الخلیفۃُ من یمشی شریعۃ النبی فی الناس ولیظہر علی یدہ موعود اللہ لنبیتہ ظہور دارد ولطبنے،	خلیفہ وہ ہے جو نبی کی شریعت کو لوگوں میں جاری کرے اور اس کے ہاتھ پر خدا کے وہ وعدے جو اس کے نبی کے ساتھ تھے پورے ہوں۔

© rasailojaraid.com

ظاہرش تمشیت است و باطنش داعیہ ایست قویہ کہ بواسطۂ پیغمبر در دل او متمکن شدہ بلکہ از جذرِ دلِ او جوشدہ اگر ایں داعیہ از دلِ کسے نجوشد او را خلیفۂ خاص نمی تواں گفت ؎[1]

اس کی ایک ظاہری صورت ہے اور ایک باطنی، ظاہری صورت احکام نبی کا نافذ کرنا ہے اور باطنی صورت وہ قوی داعیہ ہے جو بواسطۂ پیغمبر اس کے دل میں جاگزیں ہو بلکہ دل کی گہرائی سے جوش زن ہوتا ہے جس کے دل سے یہ داعیہ جوش زن نہ ہو، اس کو خلیفۂ خاص نہ کہیں گے۔

یہ ہے اسلام کے روحانی نظام کی اجمالی اطلاع جس کی جسارت محترم ومکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریک واصرار پر راقم عاجز کو کرنی پڑی، ورنہ جو معلومات اوپر فراہم کی گئیں ان سے حقیقت حال کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ روحانی نظام قیل و قال کی چیز نہیں بلکہ یہاں عارف رومیؒ جیسے دیدہ ور کی یہ تاکید ہے ؎

قال را بگذار، مردِ حال شو ٭ پیش مردے کاملے پامال شو

نظام روحانی سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ کسی مستند صحبت یافتہ صاحب مشاہدہ بزرگ کی صحبت اختیار کی جائے، حضرت علی متقی، صاحب کنز العمال بڑے محدث بھی ہیں اور ولیٔ کامل بھی، وہ اپنے دریا بہ کوزہ رسالہ "تبیین الطرق الی اللہ" کو اس فقرہ پر ختم فرماتے ہیں۔

واما احتیاج الناس الی المرشد والاستاذ فلابد منہ لتحصیل الطریق وسرعۃ الوصول واما سلوک الطریق بغیر المرشد والاستاذ فھو فی الجملہ ممکن لمن وفقہ اللہ بموجب قولہ "وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا

حصولِ طریقت اور سرعت وصول کے لئے کسی مرشد واستاد کی حاجت ضروری ہے کیونکہ گو فی الجملہ بغیر مرشد واستاد کے بھی جس کو خدا توفیق دے سلوک وطریقت میں کامیابی ہوسکتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "جو لوگ ہمارے لئے ہماری راہ میں کوشش کرتے

---

[1] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔ جلد اول فصل سوم

© rasailojaraid

لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ؕ بتعب شدید و مدۃ طویلہ و ھو نادرًا جدًا [1]

ہیں یقیناً ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت عطا فرماتے ہیں" مگر یہ بڑے مجاہدے اور مدتِ دراز کے بعد ہوتا ہے اور وہ بھی بہت ہی شاذ و نادر۔

ظاہر ہے کہ نادر کو کلیہ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی نہ کوئی عاقل قاعدۂ کلیہ کو چھوڑ کر مستثنیٰ کے درپے ہونا گوارا کرے گا۔ یہاں صحبت ازبس ضروری ہے اور صحبت بھی ایسے کی جس کا سلسلۂ صحبت، صحبت نبوی تک متصل ہو۔ سب جانتے ہیں کہ سلسلۂ سند کا اہتمام یا تو محدثین میں ہے یا پھر شیوخ طریقت میں اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ محدثین کرام کو یہ احتیاط ملحوظ ہے کہ اقوالِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) غیر نبی کے اقوال کی ملاوٹ سے پاک رہیں اور شیوخ طریقت کو جن کا لگاؤ صحبتِ نبوی کے فیوض، برکات اور انوار خود ساختہ مصلحین کی کدورتوں اور ظلمتوں سے پاک رہیں۔

اب رہا یہ اشکال کہ جب یہ علم صحبتی علم ہے تو اس موضوع پر اکابر شیوخ کی اتنی کتابیں کیوں ملتی ہیں۔ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ جن اکابر صوفیاء نے یہ کتابیں تصنیف فرمائیں وہ مدارس کے لیے تھیں نہ عام مسلمانوں کے لئے بلکہ وہ صرف طبقۂ سالکین کے لئے تھیں تاکہ دورانِ مجاہدہ و سلوک انہیں جو اشکالات پیش آئیں انہیں رہبری حاصل رہے یا جو احوال و عبقات یا مشاہدہ و مکاشفات حاصل ہوں ان کی حقیقت کو سمجھ کر تصدیق یا بصورت دیگر تصحیح کی سہولت حاصل رہے۔
ان کتابوں پر اور ان صوفیانہ اصطلاحات پر جو زمانہ بہ زمانہ وضع ہوئیں اور برتی گئیں اصل نظامِ روحانی کا جو نبی امی فداہ ابی امی کی صحبت بابرکت، فیضانِ نظر اور انفاس قدسیہ سے صحبتِ متواترہ کے ذریعہ ملا ہے، قطعاً دار و مدار نہیں، اسی لئے محمد غزالی ہوں یا جلال رومی، فخر رازی ہوں یا برکات احمد

---

[1] یہ رسالہ مخطوطہ شکل میں تھا۔ اس کی اولین اشاعت کی سعادت راقم الحروف کے حصہ میں آئی۔ پہلی مرتبہ یہ رسالہ "البعث الاسلامی" (لکھنؤ) بابت جولائی ۱۹۶۳ء (غالباً) میں چھپا، پھر اردو ترجمہ کے ساتھ اس کی دوبارہ اشاعت ماہنامہ "بیّنات" (کراچی) بابت فروری ۱۹۶۴ء میں ہوئی جب اس کی ادارت میرے ہاتھ میں تھی۔

© rasailojaraid.c

ٹونکی سرِ طالب تزکیہ و تصفیہ باطن کو یہاں اوّلین انتباہ یہی ملتا ہے کہ ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن — سینہ را از نورِ حق گلزار کن

افسوس کہ عہدِ الست اور طریقت کے ناآشنا دانشور، ریسرچ سکالرز، الٰہیات میں عقلی گھوڑے دوڑانے والے فلسفی اور تخیلات کے پتنگ اڑانے والے شاعر اور مستشرقین کے پیروؤں کے ہاتھوں میں صوفیائے کرام کی یہ کتابیں پہنچ کر عجب مضحکہ خیز رائے زنی اور رد و قبول کا شکار ہو گئی ہیں، ان حرف زنوں کی نہ تصدیق معتبر نہ تکذیب معتبر بلکہ آشنائے حقیقت یہ کہہ کر ان سے منہ موڑ لینے پر مجبور ہے کہ ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را — چہ شناسی زبانِ مرغاں را

اللہ تعالیٰ ان "ضلوا واضلوا"[1] کے مصداق مدعیانِ افہام و تفہیم کے فتنہ سے اہلِ اسلام کو بچائے اور اصلی حقائق کے متلاشیوں کو اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھوں میں فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ آئیں، شیخ اکبرؒ کے سے کسی واقفِ اسرار کی صحبت میں پہنچائے، اس سے پیشتر کہ وہ مکتوباتِ سی صدی کو سمجھنے کی کوشش کریں شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کی سند صحبت رکھنے والے کی خدمت میں بار عطا کرے، اس کے بجائے کہ وہ مکتوباتِ امام ربانی اور معارف لدنیہ اپنی فہم نارسا سے دیکھیں انہیں مجدد الف ثانی والے صاحبِ فیض کی توجہ کا مورد بنائے۔ اس کے بجائے کہ وہ فیوض الحرمین اور سطعات و ہمعات کو سمجھنے کی کوشش کریں انہیں وقت کے کسی ولی اللہ کا فیضانِ نظر بخشے، اس سے پہلے کہ کوئی مولوی صاحب قرآن کے تصورِ تزکیۂ نفس یا تصورِ تقویٰ پر قلم رانی کا تہیہ کریں انہیں شاہ اشرف علی تھانوی جیسے صاحب نظر و خبر کی صحبت میں آکر نورِ نظر اور مشاہدۂ حقیقت حاصل کرنے کی توفیق بخشے تاکہ ان کی خدمات سے ملتِ اسلامیہ کو قرنِ اوّل والا نفع حاصل ہو،

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب

[1] ترجمہ: "تحقیق کہ خود بھٹکے اور دوسروں کو گمراہ کیا"۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں جو قیامت کے قریب پیدا ہونے والے بے بصر اہلِ علم اور ان کے خطرے سے بچانے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے تھے۔

© rasailojaraid.c